حکمتِ سیّد مودودیؒ

خلافتِ ارضی کا مفہوم

از۔ خالد علوی صاحب ادارہ معارفِ اسلامی لاہور

سیّد مودودیؒ سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۱۰۵ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے ایک ایسا مطلب نکال لیا ہے کہ جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظامِ دین کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دُنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت و فرمانروائی اور زمین کے وسائل پر تصرّف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انہی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدۂ کلیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثتِ زمین ہے، جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر ان قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دُنیا میں پہلے وارثِ زمین رہی ہیں، اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کافر، مشرک، دہریے، فاسق، فاجر، سب یہ وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پا رہے ہیں۔ جن قوموں میں وہ تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں جنہیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فسق، فجور، معصیت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جا رہی ہیں۔ فرعون و نمرود سے لے کر اس زمانے کے کمیونسٹ فرمانرواؤں تک کتنے ہی ہیں جو کھلم کھلا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ مدّمقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارثِ زمین ہوئے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدۂ کلیہ تو غلط نہیں ہو سکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ "صالح" کے اس مفہوم میں ہے

جو ابنک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں "صالح" قرار پاسکیں، قطع نظر اس کے کہ وہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق ہوں یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصورِ "صلاح" کو ڈارونی تصورِ "صلاحیت" (FITNESS) سے لے جاکر ملا دیتے ہیں۔

اِس نئی تفسیر کی رُو سے آیت زیرِ بحث کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی ممالک کو فتح کرنے اور اُن پر زور و قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی "خدا کا صالح بندہ" ہے اور اس کا یہ فعل تمام "عابد" انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ "عبادت" اس چیز کا نام ہے جو یہ شخص اور گروہ کر رہا ہے، اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجہ میں وراثتِ زمین سے محروم رہ جاتے ہیں تو نہ تمہارا شمار عالحین میں ہوسکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جاسکتا ہے۔

یہ معنی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر "صلاح" اور "عبادت" کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرُّسل اور ایمان بالکُتُب) کیا ہے جس کے بغیر، خود اسی قرآن کی رُو سے، خدا کے ہاں کوئی عملِ صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اِس دعوت کے کیا معنی ہیں کہ اس نظامِ اخلاق اور قانونِ زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعے بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور مغضوبِ بارگاہِ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمانداری کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ اُن سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان، اسلام، توحید، آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنی بدل ڈالے تاکہ وہ سب اُن کی اِس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں۔ اور اس ایک چیز کو ٹھیک بٹھانے کی خاطر انہوں نے قرآن کی ساری تعلیمات کو اُلٹ پلٹ کر ڈالا۔ اس پر لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ اُن کی اس مرمتِ دین سے اختلاف کرتے ہیں

اُن کو یہ اُلٹا الزام دیتے ہیں کہ "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں"۔ یہ دراصل مادّی ترقی کی خواہش کا ہیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بُری طرح لاحق ہو گیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

ان کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالانکہ اُصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظامِ فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کوئی شخص جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقویٰ اور بھلائی کہتا ہے وہ "مادّی ترقی اور حکمرانی کی صلاحیت" کی ہم معنی نہیں ہے، اور "صالح" کو اگر "صاحبِ صلاحیت" کے ہم معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے بے تکلف جو معنی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالانکہ ہر آیت کے صحیح معنی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا تھا کہ اُوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آرہا ہے وہ عالمِ آخرت میں مومنین، صالحین اور کفار و مشرکین کے انجام سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکایک اس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کونسا موقع تھا کہ دُنیا میں وراثتِ زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اُصولوں کو مدّنظر رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف ہے کہ دوسری تخلیق میں، جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہوں گے اور اس ابدی زندگی کے نظام میں موجودہ عارضی نظامِ زندگی کی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ مومنون آیات ۱۰-۱۱ میں بھی ارشاد ہوا ہے اور اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورۂ زمر کے خاتمہ پر بیان کیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفخِ صورِ اوّل و ثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفر کا انجام بیان کرکے

نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ۝ " اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقوٰی اختیار کیا تھا وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو اُن کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے منتظم اُن سے کہیں گے کہ سلام ہو تم کو۔ تم بہت اچھے رہے آؤ اب اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اُس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا۔ اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔" دیکھیے یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں اور دونوں جگہ وراثتِ زمین کا تعلق عالمِ آخرت سے ہے نہ کہ اِس دُنیا سے۔

اب زبور کو لیجیے جس کا حوالہ آیت زیرِ بحث میں دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بائبل کے مجموعہ کتبِ مقدسہ میں زبور کے نام سے جو کتاب اس وقت پائی جاتی ہے۔ یہ اپنی اصلی غیر محرّف صورت میں ہے یا نہیں، کیونکہ اس میں مزامیرِ داؤد کے علاوہ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی خلط ملط ہو گئے ہیں اور اصلی زبور کا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم جو زبور اس وقت موجود ہے اس میں بھی نیکی اور راست بازی اور توکل کی نصیحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہوں گے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا، تو اُس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہو گا، لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے ...... ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہو گی ...... صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے" (۳۷ داؤد کا مزمور آیات ۹-۱۰-۱۱-۱۸-۲۹-)

دیکھیے یہاں راست بازوں کے لیے زمین کی دائمی وراثت کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ

آسمانی کتابوں کی رُو سے خلود اور ابدی زندگی کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا کی زندگی سے۔

دُنیا میں زمین کی عارضی وراثت جس قاعدے پر تقسیم ہوتی ہے اسے سورۂ اعراف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ۔ (آیت ۔۱۲۸) "زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ مشیتِ الٰہی کے تحت یہ وراثت مومن اور کافر، صالح اور فاسق، فرمانبردار اور نافرمان، سب کو ملتی ہے، مگر جزائے اعمال کے طور پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر، جیسا کہ اِسی آیت کے بعد دوسری آیت میں فرمایا: وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (آیت ۱۲۹) اور وہ تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو" اس وراثت میں دوام اور ہمیشگی نہیں ہے۔ یہ مستقل اور دائمی بندوبست نہیں ہے۔ یہ محض ایک امتحان کا موقع ہے جو خدا کے ایک ضابطے کے مطابق دُنیا میں مختلف قوموں کو باری باری دیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس آخرت میں اِسی زمین کا دوامی بندوبست ہوگا۔ اور قرآن کے متعدد واضح ارشادات کی روشنی میں وہ اس قاعدے پر ہوگا کہ "زمین اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے صرف مومنینِ صالحین کو اس کا وارث بنائے گا، امتحان کے طور پر نہیں، بلکہ اُس نیک رویے کی ابدی جزا کے طور پر جو اُنہوں نے دُنیا میں اختیار کیا"۔

آگے چل کر اِسی مضمون کو سورۂ نور کی آیت ۵۵ کی تشریح کرتے ہوئے مزید وضاحت کرتے ہیں۔

اِس ارشاد سے مقصود منافقین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ فرمایا ہے اُس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں، اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں، اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ اِن صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ اُن سے کیا ہی گیا ہے، لہٰذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔

بعض لوگ خلافت کو محض حکومت و فرماں روائی اور غلبہ و تمکّن کے معنی میں لے لیتے ہیں، پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے وہ مومن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیرو اور بندگیٔ حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے، اور اس پر مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے ایمان، صلاح، دینِ حق، عبادتِ الٰہی اور شرک، ہر چیز کا مفہوم بدل کر وہ کچھ بنا ڈالتے ہیں جو ان کے اس نظریے کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے۔ جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی ہے۔ اس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنی پہنا دیے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو مسخ کر ڈالتے ہیں اور اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لامحالہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں جنھوں نے کبھی دنیا میں غلبہ و تمکّن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں، خواہ وہ خدا، وحی، رسالت، آخرت، ہر چیز کے منکر ہوں اور فسق و فجور کی ان تمام آلائشوں میں بُری طرح لتھڑے ہوئے ہوں جنھیں قرآن نے کبائر قرار دیا ہے، جیسے سود، زنا، شراب اور جوا۔ اب اگر یہ سب لوگ مومن صالح ہیں اور اسی لیے خلافت کے منصبِ عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنی قوانینِ طبیعی کو ماننے، اور صلاح کے معنی ان قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علومِ طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت و حرفت اور تجارت و سیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی کا مطلب پھر اس کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے کہ اُن قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے جو انفرادی اور اجتماعی سعی و جہد کی کامیابی کے لیے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں؟ اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ اُن مفید قواعد و ضوابط کے ساتھ کوئی شخص یا قوم کچھ نقصان دہ طریقے بھی اختیار کر لے؟ مگر کیا کوئی شخص جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی ایمان اور عملِ صالح اور دینِ حق اور عباداتِ الٰہی اور توحید اور شرک یہی معنی ہیں؟ یہ معنی یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی کہیں سے لے کر اس کو اپنے نظریات و تصوّرات کے مطابق ڈھال لیا ہو، یا پھر وہ شخص یہ حرکت کر سکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے اُن سب آیات کو اپنے زعم میں سراسر

لغو اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو جن میں اللہ تبارک و تعالیٰ کو واحد رب اور الٰہ، اور اُس کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعہ ہدایت، اور اُس کے مبعوث کردہ ہر پیغمبر کو عملی طور پر واجب الاطاعت رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور موجودہ دُنیوی زندگی کے خاتمے پر ایک دوسری زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اُس زندگی میں اپنی جواب دہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر محض اس دُنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں ان مضامین کو اس قدر کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے اور ایسے صریح و صاف الفاظ میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمانداری کے ساتھ پڑھنے والا کوئی شخص کبھی اُن غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیت استخلاف کے یہ نئے مفسرین مبتلا ہوئے ہیں۔ حالاں کہ لفظ خلافت و استخلاف کے جس معنی پر انھوں نے یہ ساری عمارت کھڑی کی ہے وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے، قرآن کا جاننے والا کوئی شخص اس آیت میں وہ معنی کبھی نہیں لے سکتا۔

قرآن دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ہر جگہ سیاق و سباق سے پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنی میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔

اس کے ایک معنی ہیں "خدا کے دیے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا" اس معنی میں پوری اولادِ آدم زمین میں خلیفہ ہے۔

دوسرے معنی ہیں "خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کے امر شرعی (نہ کہ محض امر تکوینی) کے تحت اختیاراتِ خلافت کو استعمال کرنا" اس معنی میں صرف مومنِ صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے، کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے اور اس کے برعکس کافر و فاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے، کیونکہ وہ مالک کے مُلک میں اُس کے دیے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔

تیسرے معنی ہیں "ایک دَور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا"۔ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنی "نیابت" سے ماخوذ ہیں اور یہ آخری معنی خلافت بمعنی "جانشینی" سے ماخوذ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنی لغتِ عرب میں معلوم و معروف ہیں۔

اب جو شخص بھی یہاں اس سیاق و سباق میں آیت استخلاف کو پڑھے گا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس امر میں شک نہیں کرسکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اُس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اللہ کے امر شرعی کے مطابق (نہ کہ محض قوانینِ فطرت کے مطابق) اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لیے کفار تو درکنار، اسلام کا دعوٰی کرنے والوں منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جارہا ہے۔ اسی لیے فرمایا جارہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں۔ اسی لیے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ کا پسندکردہ دین، یعنی اسلام، مضبوط بنیادوں پہ قائم ہوجائے گا۔ اور اسی لیے اس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جارہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پہ قائم رہو جس میں شرک کی ذرا برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس وعدے کو یہاں سے اُٹھا کر بین الاقوامی چوراہے پہ لے پہنچنا اور امریکہ سے لے کر روس تک جس کی کبریائی کا ڈنکا بھی دنیا میں بج رہا ہو اُس کے حضور اُسے نذر کردینا جہالت کی طغیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ سب طاقتیں بھی اگر خلافت کے منصبِ عالی پہ سرفراز ہیں تو آخر فرعون اور نمرود ہی نے کیا قصور کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں لعنت کا مستحق قرار دیا؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، الانبیاء، حاشیہ ۹۹)۔

اس جگہ ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے۔ بلاواسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اُس وقت واقعی مسلمانوں پہ حالتِ خوف طاری تھی اور دینِ اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالتِ خوف نہ صرف امن سے بدل گئی، بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پہ چھا گیا، اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں، کرۂ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کرسکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہرِ تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومنِ صالح ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو نہج البلاغہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی وہ تقریر

پڑھ لے جو انہوں نے حضرت عمرؓ کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔ اس میں فرماتے ہیں:

"اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت و قلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اللہ کا لشکر ہے جس کی اس نے تائید و نصرت فرمائی۔ یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اللہ خود فرما چکا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ...... اللہ اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی ضرور مدد کرے گا۔ اسلام میں قیّم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتے کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹتے ہی موتی بکھر جاتے ہیں۔ اور نظم درہم برہم ہو جاتا ہے اور پراگندہ ہو جانے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں۔ مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قوی بنا دیا ہے۔ آپ یہاں قطب بن کر جمے بیٹھے رہیں۔ اور عرب کی چکی کو اپنے گرد گھماتے رہیں۔ اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں۔ ورنہ آپ اگر ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا۔ اور نوبت یہ آ جائے گی کہ آپ کو سامنے کے دشمنوں کی بہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہو گی اور اُدھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظر جما دیں گے کہ یہ عرب کی جڑ ہے اسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے۔ اس لیے وہ سارا زور آپ کو ختم کر دینے پر لگا دیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہلِ عجم بڑی کثیر تعداد میں اُمنڈ آئے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہم جو اُن سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرتِ تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں، بلکہ اللہ کی تائید و نصرت ہی نے آج تک ہمیں کامیاب کرایا ہے۔

دیکھنے والا خود بھی دیکھ سکتا ہے کہ اِس تقریر میں جناب امیر کس کو آیتِ استخلاف کا مصداق ٹھیرا رہے ہیں۔

سیاسی جماعتیں اور اسلام کا سیاسی نظام

جناب محمد   دین صاحب ریاض یونیورسٹی

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن حکیم اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قول وفعل سے جو سیاسی تعلیمات واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ وہ ایک سیاسی نظام کا بنیادی ڈھانچہ تو فراہم کرتی ہیں، لیکن اس نظام کی فروعی تفصیلات ہمیں عطا نہیں کرتیں۔ مثلاً شوریٰ کی آیات اور آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا عمل شوریٰ کو واجب تو ضرور ٹھہراتا ہے لیکن اس کی تفصیلات مہیا نہیں کرتا کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل کیسے ہونی چاہیے؟ اس کے اعضاء میں کون سی صفات ہونی چاہییں؟ سلطہ تنفیذیہ اور قضائیہ سے اس کا تعلّق کیسا ہونا چاہیے؟ اس کا دائرہ کار کیا ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور دوسرے بہت سے فروعی سوالات ہیں جن کے جوابات شارع نے ہمیں نہیں دیئے ہیں۔

اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ایسا کسی خامی اور کمزوری کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی حکمت پوشیدہ کر رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان ہر زمانے میں اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق اس کی تفصیلات طے کرتے رہیں اور یہی شریعت اسلامی کے مزاج کے مطابق بھی ہے کیونکہ اس شریعت کو تا ابد قائم رہنا ہے اور اگر کچھ جامد جوابات ان سوالات کے دیئے بھی جاتے تو وہ ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات میں کامیاب نہ ہو سکتے اور یہ بات شریعت اسلامی کے دوام اور کمال کے خلاف ہوتی۔

اسلام کا سیاسی نظام اپنی صحیح سپرٹ میں صرف خلفاء راشدین کے زمانے میں جاری رہ سکا۔ اور بعد میں انحرافات کا شکار ہو گیا۔ بیسویں صدی میں جب مسلمان ممالک مغربی استعمار سے آزاد